ڈاکٹر محمود غازی اور اسلام کے قانون بین الممالک کی تشریح

* ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی

ڈاکٹر محمود احمد غازی کی تحریروں سے راقم دیر سے واقف ہوا، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی کتابیں ہندوستان میں کافی تاخیر سے پہنچی ہیں اور سب تو ابھی یہاں ملتی بھی نہیں۔ بہر کیف ایک بار جب ان کی ایک کتاب پڑھ لی تو پھر ایسا شوق دامن گیر ہوا کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جو بھی کتاب ان کی یہاں ملی بالاستیعاب پڑھ ڈالی، جس میں خاص کر ان کی محاضرات سیریز ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے سفر میں ان کی بیش قیمت تحریر خطبات بھاولپور (۲) خریدی اور اسے بالاستیعاب پڑھا۔ یہاں اسی کتاب کے سلسلہ میں اختصار کے ساتھ چند گزارشات پیش کروں گا۔

یہ کتاب ڈاکٹر غازی کے ۱۲ خطبوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے جامعہ بھاولپور میں دیے تھے۔ اور ان کا موضوع اسلام کا بین الاقوامی قانون یا قانون بین الممالک ہے۔ پوری کتاب میں ڈاکٹر صاحب ایک راسخ العقیدہ عالم و مفکر اور مجتہدانہ سوچ رکھنے والے مصنف کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ بہت سے ان مسائل پر بھی جن کے بارے میں جدید علماء و مفکرین از سر نو غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے سلف کے نقطہ نظر کی وکالت کی ہے اور وہ بھی دل نشین، عصری اور reasonable دلیلوں کے ساتھ بعض جگہوں پر وہ فقہائے متقدمین سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ اور اختلاف کو بھی بڑے شائستہ، خوبصوت اور مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بعض بحثوں پر ان کی گفتگو کو پڑھتے وقت مجھ کو بارہا محسوس ہوا کہ گویا قدرت نے سید ابوالاعلی مودودیؒ کا قلم انہیں پکڑا دیا ہے۔ بالکل وہی سیر حاصل بحث وہی عقلی و نقلی دلائل۔ اس پر مستزاد غازی صاحب کا فقہ اسلامی کا وسیع مطالعہ (۱) معتدل انداز فکر اور عصر حاضر سے بھرپور واقفیت یعنی ان کی ذات میں قدیم و جدید کا خوبصورت امتزاج ہو گیا ہے۔

اسلام کے قانون بین الممالک یعنی 'فقہ سیر' پر نئے اسلوب میں گفتگو اور تحقیق کا عمل بیسویں صدی کی ابتداء میں شروع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، سید ابوالاعلی مودودیؒ اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی وغیرہم نے کاوشیں پیش کیں۔ ڈاکٹر غازی کی اس کتاب کے ذریعہ 'فقہ سیر' کا تصور واضح اور اس کے عہد بہ عہد ارتقاء کا ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے

---

* ڈائریکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز C-3o3/3 شاہین باغ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ Email: ghitreef1@yahoo.com

آجاتا ہے۔(۲)اور چونکہ نئے حالات اور زمانی تغیرات کو سامنے رکھ کر ہی اس میں گفتگو کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب فقہ الاقلیات کے مباحث میں بھی ایک قیمتی اضافہ ہے۔

دارالاسلام اوردارالحرب:

اسلام میں بین الاقوامی لین دین یا تعلقات بین الاقوام کے اندر مسلم وغیر مسلموں کا جوفرق پایا جاتا ہے اس کا reason وہ یوں دیتے ہیں کہ:

> ''یہ بات انسان کے مزاج میں شامل ہے کہ وہ اپنے اور پرائے میں ہر حال میں فرق رکھتا ہے۔ جو تعلقات اپنوں سے رکھے جاتے ہیں وہ پرایوں سے نہیں ہوتے انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جو معاملہ وہ اپنے قریبی لوگوں سے کرتا ہے وہ اجنبی لوگوں سے نہیں کرتا'' اسلام نے بھی دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بہت سے احکام میں اس کا خیال رکھا ہے۔''(۳)

فقہاء اسلام نے دارالسلام اور دارالکفر جیسی اصطلاحات کیوں استعمال کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ:

قرآن نے 'رنگ نسل اور زبان کو قومیت کی بنیاد کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ قرآن مجید نے نظریہ اور عقیدہ ہی کو قومیت اور امت کی اساس مانا ہے'' (۴) دارالکفر لازماً دارالحرب نہیں ہوتا بلکہ یہ تغلیباً ہے۔یعنی فقہاء اسلام کے دور میں اسلام اور کفر میں عملا جنگ ہورہی تھی ،اوراس میں بھی اکثر اہل کفر کی جارحیت ہوتی تھی ،لہٰذاانہوں نے اسی واقعی صورت حال کو دارالحرب سے تعبیر کردیا۔

اس سلسلہ میں دو بنیادی غلط فہمیاں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمان دار الاسلام سے باہر ساری دنیا کو دشمن سمجھتے ہیں اور ہر غیر مسلم سے سدا برسرپیکار رہنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔بعض فقہاء کی مجمل عبارتیں بھی اس غلط فہمی کی بنیاد بنتی ہیں مثلا کہا جاتا ہے کہ:**علاقة المسلين بغير المسلم الحرب لا الهدنة** (ملاحظہ ہو،اکرم ضیاء العمری: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ: ۴۴۸) یعنی غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت جنگ ہے صلح نہیں۔دوسرا یہ کہ **الکفرملة واحدة** لہٰذا سارے غیر مسلم ایک جیسے ہی ہیں اور دشمن اسلام ہیں۔ اس کے بارے میں غازی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دارالحرب یا دارالکفر میں اگر مختلف نظریات اور مذاہب پائے جاتے ہیں تو ان کو تسلیم نہ کیا جائے... یا ان سب سے ایک ہی جیسے تعلقات رکھنے کو لازمی

سمجھا جائے گا۔ اس اصول کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اسلام کے دائرہ سے باہر جتنے بھی نظریات، عقائد اور فلسفے پائے جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر جو ریاستیں اور حکومتیں وجود میں آتی ہیں ان سب کو دارالاسلام سے الگ ایک منفرد کٹیگری کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ کہ وہاں کے مسلمان شہریوں کا برتر قانون اسلام نہیں ہے۔" (۵)

مسلم اقلیت کا ریاست سے تعامل

اسلامی قانون پر ایک الزام اپنے اور غیر یہ لگاتے رہے ہیں کہ اس کی فقہ اسلام کے دور عروج اور زمانۂ اقتدار کی پیداوار ہے۔ وہ مسلمان کو یہ تو سکھاتی ہے کہ وہ حکومت کیسے کرے مگر وہ جب محکوم ہو تو اس کا عمل کیا ہو یہ وہ نہیں بتاتی۔ یعنی Modesty کے لیے اسلام میں کوئی ماڈل نہیں ہے۔ مگر یہ الزام اس لیے غلط ہے کہ مسلم اقلیتیں ہر دور میں رہی ہیں حتی کہ عہد نبوی اور عہد راشدی میں بھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر محمود غازی نے اپنی تحقیق میں یہی بتایا ہے "خلفاء راشدین کے زمانہ میں حبشہ کے علاوہ مسلمانوں کی ایک قابل ذکر اقلیت مختلف علاقوں میں تھی۔ اپنے اپنے ممالک کی شہریت ان کو حاصل رہی (٦) اسے مسلمانوں کی ریاست سے رسمی تعلق نہ تھا اور خود ان کے اپنے ممالک سے تعلقات کے سلسلہ میں قرآن پاک میں بنیادی ہدایتیں ہیں۔ پھر ان مسلمانوں کا تعامل بھی ملتا ہے، مثلاً حبشہ کے مسلمانوں نے حبشہ کی حکومت (عیسائی) کی طرف سے اس کے دشمنوں سے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ (۷) یہ بڑی اہم بحث ہے اور یوں اور زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ آج دنیا کی کل مسلم آبادی کا ایک تہائی حصہ وہ ہے جو اقلیت کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبشہ ماڈل موجودہ مسلم اقلیتوں کے بحث و مباحثہ کا موضوع بننا چاہیے۔

البتہ ڈاکٹر غازی کی بعض آراء اور بیانات سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے مثلاً حلف الفضول کے بارے میں ان کا یہ کہنا ہے کہ وہ خالصتاً بین الاقوامی نوعیت اور مقاصد کا معاہدہ تھا۔ (۸) جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس معاہدہ کا jurisditcion صرف مکہ تھا۔ یعنی مکہ کے کچھ نوجوانوں نے، جس میں ایک راویت کے مطابق فضل نام کے کئی افراد تھے، عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہو کر یہ معاہدہ کیا کہ مکہ میں کسی پر ظلم نہ ہونے دیں گے۔ اس مقامی نوعیت کی چیز کو بین الاقوامی آخر کس طرح مانا جا سکتا ہے؟

عرب سے یہود و نصاریٰ کا اخراج

جزیرۃ العرب کے بارے میں روایتیں بتاتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری لمحات میں جزیرۃ العرب سے

یہود ونصاریٰ کو دیس نکالا دینے کا حکم دیا تھا۔ **اخرجو الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب** ،اور **لایبقی دینان فی العرب** وغیرہ الفاظ میں یہ حکم حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ بظاہر یہ اسلام کا متعصبانہ رویہ محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر غازی کہتے ہیں کہ:

> ''ایسا ان سے کسی تعصب ونفرت کی وجہ سے نہیں کیا گیا ان کے اخراج سے مراد یہ ہے کہ یہ علاقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کا روحانی دارالحکومت ہوگا یہاں صرف توحیدی نظریہ رہے گا۔ خالص اسلامی عقیدہ کی حکمرانی یہاں قبول کی جائے گی۔ دنیا کی کئی قوموں میں اس طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں مثلا روم میں ویٹیکن سٹی میں صرف رومن کیتھولک عیسائیوں کو ہی جائداد خریدنے اور مستقل آباد ہونے کی اجازت ہے کیونکہ وہ رومن کیتھولک عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور یہیں پاپائے اعظم رہتا ہے۔ وہ اس کو اپنے دین کا مرکز سمجھ کر اسے خالص رکھنا چاہتے ہیں''۔(۹)

تاہم یہاں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثال sustainable نہیں ہے۔فرض کریں کہ کل ویٹیکن وہاں مسجد بنانے کی اجازت دے دے اور مکہ میں چرچ بنانے کی اجازت مانگے (جیسا کہ اس کی طرف سے یہ بات بین المذاہبی مذاکرات میں آئی ہے)تو پھر ہم کیا توجیہ کریں گے؟

پلورل سوسائٹی اور اسلام

ڈاکٹر غازی صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ تکثیری سماج کے لیے بھی اسلامی نظام ہی بہترین ماڈل فراہم کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں کے رنگ، زبان، نسل اور علاقے کی بنیاد پر نہیں نظریہ وعقیدہ کی بنیاد پر طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ جو کہ ہر انسان کے اپنے اختیار اور پسند کی بات ہے۔ یورپ کے موجودہ نظام کی بات کریں، جس کی فکری بنیادیں یونانی تصوررات، رومی مادیت پرستی، قرون وسطی کی مسیحیت، اور آخر میں Rennaissance کے الحادی افکار سے اٹھی ہیں، اس پر ان چار عناصر نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس لیے وہ پوری دنیا کو ایک عادلانہ اور مساویانہ نظام نہیں دے سکتے۔ اسے آپ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کی پیش رو انجمن اقوام میں دیکھ سکتے ہیں۔ ویٹو پاور طاقت ور یوروپی ممالک یا دنیا کی بڑی قوتوں کو دیا گیا ہے بقیہ دنیا اس سے محروم ہے۔(۱۰) اسلام میں انسانوں میں مساوات، عدل کا قیام اور ایفائے عہد کو زبردست اہمیت دی گئی۔ جس کی زریں مثالیں عہد نبوی، عہد راشدی اور بعد کی اسلامی تاریخ میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ یہ صرف وحی حق ہے جو سارے انسانوں کے

مفادات ومصالح کی رعایت رکھ سکتی ہے (اقبال کے الفاظ میں 'وحی حق بینندۂ سود ہمہ') انسان اپنے مفادات سے بالاتر ہوکر ایک عادلانہ اور یکساں قانون نہیں بنا سکتا۔(۱۱)

قوت تنفیذ

مولانا وحید الدین خاں اور دوسروں کی تحریروں میں یہ بات باصرار اور بتاکید کہی جارہی ہے کہ اسلام میں اصل روح ہے فارم نہیں، داخل ہے ظاہر نہیں۔ اور اسلامی قانون یا اسلامی حکومت اصلا انسان کے داخل اور اندورن سے نکلنی چاہیے باہر سے کسی قانون کی تنفیذ کارگر نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر غازی اس تصور کی تردید کرتے ہیں ان کے مطابق اسلام میں inner sanction (ضمیر کی آواز) کے ساتھ ہی outer sanction بھی پایا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں عدالتیں پولس سزائیں وغیرہ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے ہوتے ہیں۔ صرف نماز روزہ کے لیے نہیں۔ البتہ یہاں وہ پوری بصیرت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اسلام، جس سے نفاذ کی قوت سب سے پہلے حاصل کرتا ہے، وہ مسلمانوں کی رائے عامہ کی قوت ہے اور ان کے اجتماعی ضمیر کی آواز یا شعور ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کسی قانون پر کبھی عمل درآمد نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا بھر میں قانون کا نفاذ ریاست کی ذمہ داری سے زیادہ عوام کے شعور واحساس سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندو پاک وغیرہ میں عام آدمی ہر وقت قانون کو اسی لیے توڑتا ہے کہ عام آدمی کے ضمیر کی قوت مرچکی ہے۔ اور مغرب و امریکہ میں عام آدمی قانون پر عمل درآمد کو اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ان کا inner sanction بیدار ہے۔(۱۲)

جنگ دفاعی یا اقدامی

موجودہ زمانہ میں جنگ دفاعی ہے یا اقدامی اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور شیخ محمد ابوزہرہ جیسے بڑے علماء دفاعی جہاد کے قائل ہیں انؒ کے نزدیک جہاد اقدامی نہیں ہے۔ بعینہ یہی رائے غازی صاحب کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ طبری کے حوالہ سے انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کا قول نقل کیا ہے کہ 'کاش ہمارے اور رومیوں کے درمیان آگ کا ایک ایسا سمندر حائل ہو جائے کہ نہ وہ ادھر آسکیں اور نہ ہم ادھر جاسکیں (اسوقت رومیوں سے جنگ چل رہی تھی) اور ایسے وقت میں طاقتور مسلم حکمراں کا یہ کہنا واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے مزاج میں جارحیت نہیں تھی بلکہ جارحیت کے خلاف دفاع تھا۔ تاہم ایک بار جنگ شروع ہو جائے تو اسے یک طرفہ طور پر ختم کرنا خودکشی ہے۔ اس لیے روم وایران سے جنگ چھڑ جانے کے بعد مسلمان ان دونوں سامراجوں کو ختم کیے بغیر نہیں رکے۔(۱۳)

عالمی خلافت کا تصور:

موجودہ ردور میں خلافت اسلامیہ کا احیاء ہر باشعور مسلمان کی تمنا ہے ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اور شامی عالم احسان سامی حقی نے اس کے لیے عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر غازی بھی اس کی تمنا کرتے ہیں مگر وہ بھی مذکورہ بزرگوں کی طرح عملی صورت حال کے پیش نظر یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ بالکل ضروری نہیں کہ ادارۂ خلافت کی شکل آج بھی وہی ہو جو صدر اسلام میں تھی۔ البتہ خالص مغربی طرز جمہوریت کو قبول کرنا تو مسلمان ذہن کے لیے بالکل خارج از بحث ہے۔ ڈاکٹر غازی نے لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں میں ایک انتہا یہ ہے کہ ماضی میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے اسی کو جوں کا توں دہرانا چاہتے ہیں۔ اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ بلا شبہ اسلام کے مبادی، اقدار اور مسلم تشخص کے بارے مین یہ رائے درست ہے مگر جزئیات کے بارے میں درست نہیں۔ درسرا انتہا پسندانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کو ماضی سے مکمل طور پر رابطہ توڑ کر رائج الوقت نظریات میں سے کسی کو قبول کرنا چاہے۔ مسلم دنیا کے حکمرانوں نے اسی نقطہ نظر پر عمل کیا اور اس میں مسلمانوں کی مزاحمت کو شدت سے کچلا ہے۔ پہلے نقطہ نظر کی حمایتی حزب التحریر، القاعدہ اور جماعت التکفیر والہجرۃ ہے۔ (ملاحظہ ہو گیارہواں خطبہ صفحہ ۴۳۹) جب سے خلافت کا ادارہ ٹوٹا مسلمان باوجود مختلف مکاتب فکر کی پیروی کے، احیاء خلافت کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کے قائد اور پہلے نائب صدر ڈاکٹر محمد حتا نے کہا تھا کہ موجودہ زمانے کی آزاد مسلم ریاستیں صوبوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے آزادانہ نظم سنبھال رکھا ہے کیونکہ کوئی مرکزی حکومت (خلافت) موجود نہیں (۱۴) ۱۹۲۵ میں مؤتمر اسلامی کانفرنس کے مندوبین کا شاہ عبدالعزیز سے احیاء خلافت کا مطالبہ ہو یا ۱۹۳۳ میں مؤتمر عالم اسلام (جس کی صدارت مفتی امین الحسینی اور نیابت اقبالؒ کر رہے تھے) یا مسلم دولت مشترکہ کے لیے اٹھی آوازیں۔ اسی طرح اقبال کے کارپوریٹ خلافت کا تصور، ۱۹۶۹ میں او آئی سی کا قیام سب اسی خواہش کا مظہر ہیں۔ حزب التحریر یا ڈاکٹر اسرار احمد کی ندائے خلافت سب اسی جذبہ کا اظہار کرتی ہیں۔ آگے ڈاکٹر صاحب نے بتدریج احیاء خلافت کے کئی اقدامات کی نشاندہی کی ہے مثلاً: (۱) مسلمانوں میں خلافت کے تصور کو مسلسل بیان کیا جائے تا کہ اس کی یاد زندہ رہے اور اس کی ضرورت کا

احساس باقی ہے(۲) مسلم ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ قریب لایا جائے۔(۳) ہم خیال مسلم ریاستوں کا سیاسی اتحاد پیدا ہو(۴) اسی سیاسی اتحاد کو آگے چل کر دولت مشترکہ میں بدل دیا جائے۔جیسا کہ یوروپی ریاستوں نے ایک یونین بنا کر ویزے وغیرہ کی بندشیں ختم کردی ہیں۔ڈاکٹر غازی اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہر مسلمان از خود دارالاسلام کا بالقوۃ شہری ہے۔پاسپورٹ اور ویزے جیسی مصنوعی چیزیں اس میں رکاوٹ نہیں بنی چاہییں۔اس کے لیے انہوں نے یہودی ریاست اسرائیل کی مثال پیش کی ہے۔(ملاحظہ ہو کتاب کا صفحہ ۴۵۰)

اگلا قدم ایک نیم وفاق (کنفیڈریشن) کا ہوسکتا ہے جو ممکن ہے آگے چل کر ایسا وفاق بنے جس کا سربراہ خلیفۃ المسلمین ہو اور موجودہ اس وقت موجود مسلم ریاستیں اپنی مکمل داخلی خود مختاری اور مالی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے چند مشترکہ معاملات خلیفۃ المسلمین کے سپرد کریں دیں۔(۱۵) ریاستوں کی اس داخلی آزادی اور مالی خود مختاری کے لیے انہوں نے عصرِ نبوی سے بہت سے نظائر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریروں سے پیش کیے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب کے صفحات ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶)

ایک اہم بحث اسلام میں اقتدار کی صحیح پوزیشن

جدید اسلامی تحریکات خاص کر جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین کے لٹریچر میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو جدید اسلام علم کلام میں خاصی متنازعہ فیہ بن گئی ہیں۔مثلا ان تحریکات کا کہنا ہے کہ اقتدار اور ریاست اصل ہے۔اسلامی اقتدار قائم ہونے سے ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور انبیاء کی بعثت کا مقصود بھی حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔ جماعت اسلامی اب ’حکومت الٰہیہ‘ کی جگہ ’اقامت دین‘ کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر غازی کی رائے ذرا مختلف ہے۔وہ سوال قائم کرتے ہیں کہ ’اسلام کا بنیادی اور اولین اجتماعی نصب العین کیا ہے۔کیا وہ کسی ریاست یا حکومت یا سلطنت کا قیام ہے یا وہ اس سے بڑھ کر کوئی اور بڑا اونچا نصب العین ہے۔کتاب اللہ میں پہلی سورت سے ہی جس اجتماعی نصب العین کے حصول کا ذکر کیا گیا ہے وہ امت کی تشکیل ہے ... یہ ہیئت اجتماعیہ جسے امت یا امہ کی جامع اور پر مغز اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے اسلام کا مقصد اولین ہے۔ریاست کا قیام اسی امت کے تحفظ اور بقا کے لیے ہے۔ بالفاظ دیگر امت کی تشکیل بقا اور تحفظ بالذات مقصود (مطلوب بعینہ ہے اور ریاست کا قیام بطور وسیلہ کے ضروری (مطلوب لغیرہ) ہے۔(۱۶)

اس کے بالمقابل قرآن پاک میں واضح طور پر اور بلاواسطہ طور پر کہیں بھی کوئی ایسا حکم موجود نہیں ہے۔جس میں مسلمانوں کو کسی ریاست کے قیام کی تلقین کی گئی ہو یا حکم دیا گیا ہو۔ریاست کا قیام مسلمانوں کے ذمہ فرض کفایہ ہے اور امت مسلمہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔(۱۷)

پرامن بقائے باہم کا تصور: کے سلسلہ میں ڈاکٹر غازی کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں اس کی بھرپور گنجائش موجود ہے وہ ایک تکثیری سماج کی تعمیر کرتا ہے۔اسلامی حکومت بھی اس میں مزاحم نہیں بنتی بلکہ معاون ہوتی ہے(۱۸)۔ قانون توہین رسالت کے بارے میں ان کی رائے عام رائے سے بالکل ہم آہنگ ہے۔اسی طرح مرتد کی سزا کے بارے میں بھی وہ مسلمانوں کے عام مسلک کے ساتھ ہیں ۔(۱۹)البتہ جو دلیل وہ اور اس مسلک کے دوسرے وکیل دیتے ہیں اس میں زیادہ وزن محسوس نہیں ہوتا۔کیونکہ اگر ارتداد بالکل سادہ مفہوم میں ہو یعنی ریاست کے خلاف بغاوت یا سازش وغیرہ نہ ہوحتی کہ اس کا سبب امت کی مخالفت بھی نہ ہو۔بس اس کی سادہ وجہ کوئی عقلی خلجان یا بے اطمینانی ہو تو ایسے مرتد کی سزا کس طرح وجوب قتل قرار دیں گے؟ کم از کم عقلی طور پر جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ مضبوط نہیں۔

مصلحت دین : ایک بہت بنیادی بات جو خاص طور پر آج کے جذباتیت پسند مسلمانوں کے لیے کافی Relivant ہے۔ یہ کہ کسی اقدام، پالیسی یا طرز عمل سے اسلام کے نظریہ پہ کیا اثر پڑتا ہے کہ کوئی شخص نظریہ اسلام سے کتنا قریب آتا ہے اور کتنا دور ہوتا ہے..... یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ایسا کوئی عمل یا اقدام کسی مسلمان حکمراں کے لیے جائز قرار نہیں دیا گیا جس کے ردعمل میں لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں یا یہاں تک کہ جائز اور مستحب امور میں بھی اس امر کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں اسلام کے بارے میں لوگوں کا رویہ کیا ہوگا۔ اگر اس بات کا ظن غالب ہو کہ کسی مستحب پر اصرار کرنے کے نتیجہ میں اسلام کا کوئی فرض یا واجب مجروح یا متاثر ہوگا۔تو اس مستحب پر عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔(۲۰) خاکسار کی رائے میں سلمان رشدی و تسلیمہ نسرین اور ان جیسے دوسرے افراد کے کیس میں مسلمانوں کا ردعمل یا رشدی کے لیے امام خمینی کا فتوی قتل اور طالبان کا بامیان کے مجسمے توڑنا وغیرہ اسی کیٹیگری میں آئے گا۔

بنوامیہ کے ساتھ انصاف : صدر اسلام کی تاریخ میں بنوامیہ ایک خاص کردار کے حامل ہیں ۔مجموعی طور پر ان کا عہد بنوعباس کے عہد سے امت کے حق میں بہتر رہا ہے ۔اگر چہ ان کی جو غلطیاں ہیں ان کو جواز نہیں دے سکتے ۔ لیکن مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیے ۔اردو مورخین و مصنفین بنی امیہ کے بارے میں بالعموم زیادہ

غیر رواداری واقع ہوئے ہیں۔ ان کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ان کا وطیرہ ہے حتیٰ کہ مولانا مودودی اور ان کے بعض خاص رفقاء بھی ان اثرات سے نہیں بچ سکے۔ اس وادی کو ڈاکٹر غازی نے بڑے اعتدال سے طے کیا ہے اور حضرت امیر معاویہؓ کے علاوہ مروان اور عبدالملک بن مروان کے نام بڑے احترام سے لیے ہیں حضرت امام حسینؓ کے خروج کے بارے میں بھی انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رایے سے اتفاق ظاہر کیا ہے جنہوں نے امام حسینؓ کو کوفہ جانے سے منع کیا تھا۔ واضح رہے کہ مروان اور عبدالملک بن مروان کے عمل کو امام مالک نے مؤطا میں بطور سنت کے پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں امویوں کے بارے میں ایسی متشددانہ رائے موجود نہ تھی جو آج پائی جاتی ہے۔(۲۱)

جہاد، مجاہدہ و اجتہاد: کے بارے میں خاصا کنفیوژن مسلمانوں و غیر مسلموں کے مابین پایا جاتا ہے۔ جہاد کو بالعموم قتال کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ ایک حلقہ میں مجاہدہ کو غلط سمجھا جاتا اور اسے تصوف کے قبیل کی کوئی شئے گردانا جاتا ہے، اور اجتہاد کا دورواز ہ بند بتایا جاتا ہے۔ جب کہ ایک مسلمان کی زندگی میں ان تینوں کا زبردست مقام ہے۔ اور ان میں بھی سب سے زیادہ اہمیت مجاہدہ کو حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جہاد اور اجتہاد بھی ایک مشروط اور اجتماعی ذمہ داری ہے جب کہ مجاہدہ ہر ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ جہاد و اجتہاد فرض کفایہ ہیں اور مجاہدہ یعنی انسان کے قلب وضمیر کی اصلاح اور روحانی پاکیزگی فرض عین ہے۔ ان تینوں اصطلاحات کی بڑی جامع اور خوبصورت وضاحت غازی صاحب نے فرمائی ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔(۲۲)

مذکورہ بالا سطور میں اس کتاب کا ایک سرسری سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عصری مسائل ومشکلات ہیں جن سے اس میں تعرض کیا گیا ہے۔ خاکسار کی رائے ہے کہ کتاب کے مباحث کی اہمیت کے پیش نظر ہمارے مدارس اسلامیہ اور جامعات کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں اس کتاب کا مطالعہ لازما طلبہ کو کرانا چاہیے۔ اس کے مباحث پر ڈی بیٹ اور مذاکرے کرائے جائیں کہ اس سے فائدہ دوچند ہو جاتا ہے۔

حواشی وتعلیقات

(۱) ڈاکٹر محمود احمد غازی کی وسعت مطالعہ کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئیں ان کے لحاظ سے کم از کم آج کل کے علماء کا مطالعہ تو ان کے مقابلہ میں صفر معلوم ہوتا ہے۔ مثلا انہوں نے امام شافعی کی کتاب 'الام' بالاستیعاب تین بار پڑھی۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب 'ہدایہ' کئی بار بالاستیعاب پڑھی۔ میری معلومات میں اس قسم کی مثالیں انور شاہ کشمیریؒ کے بعد بر صغیر میں تو عنقا ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اس میدان میں سلف کی یاد تازہ کر دی۔

(۲) ڈاکٹر محمود احمد غازی، خطبات بھاولپور (۲)، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونورسٹی ، شاہ فیصل مسجد کیمپس اسلام آباد، اشاعت اول ۲۰۰۷ پیش لفظ صفحہ ۱۱

(۳) وہی مصنف وہی ناشر صفحہ ۶۷

(۴) ایضا ۶۵

(۵) ایضا صفحہ ۶۸

(۶) ایضا ۷۲

(۷) ایضا ۵۱۷

(۸) ایضا ۸۲

(۹) ایضا ۸۷

(۱۰) ایضا ۹۱-۹۲

(۱۱) ایضا ۹۸

(۱۲) ایضا ۱۲۸

(۱۳) ایضا ۱۴۲

(۱۴) ایضا ۴۵۱

(۱۵) ایضا ۴۶۳

(۱۶) ایضا ۱۸۷

(۱۷) ایضا ۱۸۸

(۱۸) ایضا ۴۵۶

(۱۹) ایضا ۴۲۱

(۲۰) ایضا ۹۹ (۲۱)

(۲۱) ایضا ۲۲۳

(۲۲) ایضا ۳۲۳